نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بُلا کر اُسے بٹھا لیا، سمجھایا بجھایا۔ چائے منگوا کر پلائی۔ وہ چلے گئے۔ موسم خنکی آمیز تھا۔ سُنا ہوا ہے بہار میں جنون تیز ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک مصرعہ آیا۔ "جنوں میں فصلِ بہار ستم ہی ڈھاتی ہے"۔ تقریباً تیس برس بعد اگلے روز یہ مصرعہ یاد آیا اور ابا جی کی یاد میں چند الفاظ موزوں ہو گئے۔

یادِ پدرِ مہربان آید ہمی

جنوں میں فصلِ بہار ستم ہی ڈھاتی ہے
عظیم باپ تری یاد خون رُلاتی ہے

تری وفات نے جینے کی آرزو کھو دی
ترے پیار کی لو حوصلہ بڑھاتی ہے

تری عطوفت و رأفت کی یادیں، کہیئے
شعاعِ نور کہ سینے میں جھلملاتی ہے

تفکرات و حوادث نے کر دیا محزوں
تری حیات ہے قندیل رہ دکھاتی ہے

میں تیرے چہرۂ انور کو دیکھنے کے لئے
ترس گئی ہوں مری روح بلبلاتی ہے

ترے کمالِ خطابت کا تذکرہ جب ہو
عدو بھی کہتے ہیں تاریخ جگمگاتی ہے

عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ اور محاسبۂ مرزائیت کے سلسلہ میں عالمی مجلسِ احرارِ اسلام
اور فرزندانِ امیرِ شریعتؒ
کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں

عبد الحمید بھٹی (پریس رپورٹر) بھٹی پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱۵۷ رحیم یار خان

"ابّا جی[1] اور شاہ جی[2]"

مولانا محمد ازہر شاہ قیصر رحمہ

مجھے بڑے لوگوں سے ان کی غائبانہ شہرت کی بناء پر عقیدت و محبت کے تعلقات قائم رکھنے کا سودائے خام کبھی نہیں ہوا اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ میرے شہر میں کوئی بڑا لیڈر یا بڑا شاعر اور قومی کارکن آیا ہو اور میں شوق تعارف و ملاقات میں اس کی جائے قیام کے ارد گرد گھومتا رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک غائبانہ شہرت اور اس شہرت کی ہمہ گیری کسی انسان کی بڑائی اور بھلائی کا معیار نہیں۔ بڑائی صرف اخلاق کے لئے ہے اور بڑا آدمی وہ ہے جس کے لئے اخلاق معیاری اور بلند ہوں۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض بد اخلاق اور بے کمال انسان بھی بعض وقتی حوادث سے شہرت پالیتے ہیں — لیکن انکے قریب جا کر جب ان کے کردار کے کچھ گوشوں کو ٹٹولئے تو ان میں اچھے اعمال و اخلاق کا کوئی سرمایہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء میں جگر، احسان، روش، سیماب۔ اہل صحافت میں مولانا ظفر علی خان، سالک مرحوم، حامد الانصاری غازی، محمد عثمان فارقلیط قومی رہنماؤں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، ارباب علم و فضل میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد طیب صاحب مولانا احمد علی وغیرہ سے زائد کسی سے میرا تعارف اور تعلق نہیں۔ بڑے آدمیوں کے تعارف و تعلق کے مجھے بہت سے مواقع ملے مگر شاید آپ اس پر اعتبار نہ کریں کہ میں نے خود ان مواقع کو کھودیا اور کبھی ہر کس و ناکس سے رشتۂ محبت و عقیدت استوار کرنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی صفِ اوّل کے لوگوں میں گاندھی اور جواہر لعل تک میرے قریب سے گرج برس کر گذر گئے لیکن میں نے ذاتی طور پر

---

(۱) حضرت علامہ محمد انور شاہ کاشمیری قدس سرہٗ

(۲) امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔

ان سے تعلق پیدا کرنے میں خود اپنا نقصان سمجھا، ور ان بزرگوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے میرا تعلق بہت قدیم، مستحکم اور نیازمندانہ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین لاہور کے جلسہ میں شاہ جی کو امیر شریعت بنایا گیا تھا، اور میرے والدِ مرحوم کی تائید کے ساتھ پانچ سو علماء کی ایک جماعت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس جلسہ میں مَیں نے شاہ جی کو دیکھا شاہ جی ان دنوں جوان تھے سرخ و سپید چہرہ، بھرے بھرے بازو، چہرے پر جلال بدن میں چستی نگاہوں میں چمک، سر پر شاہ جی نے سادہ کپڑے کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گلے میں رنگین قمیص، قمیص کی آستین صرف بازوؤں تک، پاؤں میں چپل ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، رات کو میں اسٹیج پر مولوی عبدالحنان صاحب کے پاس پڑا سو رہا تھا کہ کسی شخص کی دھواں دار تقریر سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ہمارے شاہ جی تھے جو انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تقریر کر رہے تھے صبح ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کے یہاں ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی مجھے اس دن بخار تھا، اباجی نے منع کیا کہ صرف چائے پی لینا، مگر شاہ جی انڈے چھیل چھیل کر میری طرف بڑھاتے رہے اور میں کھاتا گیا، شاہ جی سے اس پہلی ملاقات کے بعد خلافِ عادت میں بہت متاثر ہوا، یقین جانئے کہ کئی برس تک اس بچپن کے عالم میں میرا یہ حال رہا کہ بالکل شاہ جی کی طرح چپل پہنتا رہا، ایسی ہی ٹوپی اوڑھتا ایسا ہی موٹا سا ڈنڈا لئے پھرتا اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسجد میں ہفتہ کے دن دفعہ طلباء کو گھیر گھار، ان کے سامنے شاہ جی کے لب و لہجہ میں اول فول تقریریں بکا کرتا۔

شاہ جی سے مجھے محبت زیادہ اس وجہ سے ہوئی کہ میرے والد مرحوم فطرۃً بہت خاموش، دنیاداری سے بالکل الگ ملنے ملانے سے نفور اور تعلقات میں ایک زبردست معیار کے انسان تھے۔ بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی یہ مشکل تھا کہ وہ اباجی کو متاثر کر سکتا اور ان سے تعریف و تحسین کے دو کلمے پا لیتا۔

۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں گاندھی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں گوشہ نشین فقیر "لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا"

نظام حیدرآباد نے انہیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بلایا۔ کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں اباجی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے، مگر اباجی نے کہا کہ "میں پیسہ لے کر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں" آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غیر ملنسار اور غیر دنیا دار آدمی کا کسی سے متاثر ہونا واقعی مشکل تھا۔ مگر اباجی، شاہ جی کے جان سے دیوانے تھے ہر وقت شاہ جی کا کلمہ پڑھتے ہر وقت انہی کا حال پوچھتے کتاب سے فراغت ہوئی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور

چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد ادریس صاحب یا مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی ہوئے اور ابا جی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا۔ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر، انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت انشاء اللہ ختم ہو جائے گی۔"

شاید سیماب کا شعر ہے کہ ؎

خاک پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا

اور واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے جاندار اور دھڑکتا ہوا دل بنا لینا بہت ہی مشکل ہے سائنس کی تجربہ کاریاں اگر متحرک، زندہ اور جاندار دل بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو تخلیق اور آفرینش سے ان کا فاصلہ کچھ دور نہیں رہتا مگر جب قدرت نے خود ارادہ کیا تو اس نے پہاڑوں کی سنگینی، بجلیوں کے زور طوفان کے شور، آندھیوں کی بلاخیزی بادلوں کی گرج درختوں کی بلندی صحرا کی وسعت صبح کی بہار آفرینی شام کی رعنائی راتوں کے سکون، پھولوں کی لطافت کلیوں کی نزاکت، بادِ صبا کی شوخی، آبشاروں کے ترنم اور بہت سی متضاد چیزوں کو جمع کر کے ایک وجود بنایا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اس کا نام لکھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں پہنچا اور چلاتا روتا رلاتا ہنستا بولتا، گرجتا برستا پھرتا رہا شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاری کی تقریروں کی روانی، ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔

ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رو دیا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آ گیا ہے، گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال) لاہور، امرتسر، راولپنڈی اور میانوالی کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنیوالی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثارِ قدیمہ میں شامل کر دیں گی۔

آج تاج محل، محل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے۔ وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے والے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جارہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بخاری نے کہا کہ "وہ دیکھو سامنے! خدیجۃ الکبریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہر نامدار کی توہین کی گئی ہے اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ لو، وہ سنو فاطمہ زہرا فرماتی ہیں کہ میرے بابا جان کی بے عزتی کی گئی ہے اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا"، تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموسِ رسالتؐ پر قربان کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں اباجی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار انقلاب لاہور میں ایک نظم چھپی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار سیاست نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں اباجی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اڑایا تھا، اس فتوے کا اس زمانہ میں اس وجہ بہت چرچا ہوگیا تھا کہ گاندھی نے اس فتوے کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں اباجی کی بیعت کا یوں ذکر کیا گیا تھا کہ ؎

کی ہے اک شاگرد کی استاذ نے بیعت قبول
بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا
انقلاب آسماں دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید
پیر انور شاہ جیسا ہے عطاء اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ اباجی، شاہ جی کی بیعت کریں۔ مگر یہاں "میاں عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرید نے مرشد میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس کے ہاتھ پر بیعت کی ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور اباجی کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی نے شاہ شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہوگئے، کسی نے شاہ جی کو برا کہا تو بگڑ گئے۔

اباجی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آجاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی خبر ہے ؟ کہیں تقریر کی یا نہیں ؟ کہاں ہیں ؟ ادھر دیوبند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں ؟

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا، ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں ؟ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ کوئی نہیں ؟ فرمایا کہ الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں ؟ میں نے کہا دیکھا تھا اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی ارشاد ہوا کہ اور زمیندار ؟ میں اس کھود کرید سے تنگ آ گیا، لہک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اٹھارہ انیس سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے، اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے اباجی چارپائی پر اپنے کھردرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے، گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے، کہاں گرفتار ہو گئے ؟ بھائی ! کیا معاملہ ہوا ذرا تفصیل سناؤ، ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھ کو احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ اباجی کے لئے بدرجۂ غایت تکلیف دہ ہوگا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا، مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہے گا، پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے۔

میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا، شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوتے۔ ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں۔

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے، آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، بظاہر یہ جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا گویا آپ ضرورتاً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے، آپ کو نیک عمل کی توفیق دے، آپکا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوس ناک ہوتا جا رہا ہے۔

شاہ جی ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ساتھ تھے اور قیام ہمارے ہی مکان پر تھا میں ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم جس مکان میں اب مقیم ہیں اس مکان میں بھی اباجی سات سال تک ہمارے ساتھ رہے، مگر اس سات سال کے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آیا کہ اباجی گھر کے باورچی خانہ میں تشریف لائے، صرف ایک مرتبہ اور یہ موقع وہی تھا جب شاہ جی ہمارے مہمان تھے، اباجی نے باہر سے آتے ہی والدہ کو آواز دی، وہ باورچی خانہ میں تھیں آواز کا جواب نہ دے سکیں۔ جلدی سے اباجی باورچی

خانہ میں تشریف لے آئے ، اماں سے فرمانے لگے کہ ارے سنتی ہو! آج ہمارے ایک بہت معزز مہمان آیا ہے ، بہت زیادہ معزز ، اس کی تواضع اور مہمان داری بہت اچھی طرح کرنی چاہیئے ابھی کسی ہمسائے کے یہاں سے ایک دو مرغ منگواؤ ان کا شوربا پکالو ، چاول پکاؤ ، کوئی میٹھی چیز بھی پکالو ، شام کو بڑے سلیقہ اور فراغت سے مہمان کو کھانا کھلاؤ"

آپ لوگوں کے نزدیک یہ کوئی بات نہ ہوگی ، کہ ہر شخص اپنے مہمانوں کی تواضع کرتا اور ان کی مدارات کے لیے مختلف اہتمام کرتا ہے مگر اباجی کا معاملہ عام لوگوں سے الگ تھا ، ان باتوں اور جھگڑوں سے ان کی بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ میں نے قرآن شریف ناظرہ سے شروع کر کے پورا حفظ کرلیا ۔ اور اس میں مجھے دو تین سال لگے ، مگر اباجی کو اس ساری مدت میں یہ نہ معلوم ہوا کہ ازہر کیا پڑھتا ہے ، جس دن میں قرآن کے حفظ سے فارغ ہوا ، اس دن ، مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم نے جو اباجی مرحوم کی مجلس علمی کے ایک ممتاز رکن اور اپنے وقت کے بڑے عالم تھے ۔ انہوں نے اباجی کو مبارک باد دی ۔ فرمانے لگے "یہ تو ہماری توقع اور علم کے بغیر ایسا ہوگیا ہے ۔ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ ازہر حفظ کر رہا ہے اور حفظ بھی اب ختم ہوگیا ہے" آپ اندازہ کیجیئے کہ جس شخص کو دنیا داری سے اتنی بے تعلقی ہو ، شاہ جی کے حال پر اس کا یہ التفات ، یہ محبت اور یہ توجہ قابل ذکر چیز ہے یا نہیں ؟

شاہ جی کا تعارف اباجی سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کرایا تھا ، وہی اس آزاد منش ، رند پارسا کو گھیر گھار کر اباجی کے پاس لائے اور پھر مدت العمر دونوں ان کی بارگاہ میں مقبول رہے ۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا سب اباجی کے اشارہ و ارشاد پر ، شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا ۔ وہ تردید قادیئت کے لیے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی ۔ ڈابھیل میں مسجد مدرسہ میں ان کا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے ، ایسی تقریر جس میں صرف مغز مغز ہوتا تھا ، الفاظ بالکل نہیں ، نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا ، تقریر ختم کر چکے مجمع اٹھ گیا ، خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرمادی ۔ ایک دن خطبہ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں ، صاحب توفیق صاحب صلاحیت صاحب سواد خوب کام کرتے ہیں ، مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں مبتلا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارہ محض اللہ کے لیے کام کیئے جاتے ہیں ۔ ہم نے قادینیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنہ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے ، آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں ۔ آپکا وہ کام دین میں ——— آپ کے لیئے نفع رساں ہوگا ۔ اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا ۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا ۔ فرمایا کہ بڑدل سے جو کام نہ ہوا وہ اس غریب نے کر دکھایا (طلباء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) آپ تو مدرسہ کی

روٹیاں کھاکر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آگئے تو آپ ان سے ملئے وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں اباجی کے انہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دورِ اوّل کے مجاہدینِ اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آنکلا ہے وہی سادگی، مشقت پسندی یکسر عمل خلاص اور للّٰہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔

ڈابھیل میں فیض اللہ بنوّری کے نام سے ایک طالب علم تھے اباجی کے یہاں ان کی رسائی صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ شاہ جی کی شان میں اپنی انمل اور بے جوڑ نظمیں بڑے بے ہنگم لہجہ میں پڑھ کر سناتے تھے اباجی ہمیشہ اس طالب علم پر توجہ کرتے اس کی مدارت فرماتے اور ہر جگہ اسے یاد رکھتے۔

یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

ابھی چند دن ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دہلی سے آتے شام کو مغرب کے بعد وہ ان کے دونوں صاحبزادے سعید اور محمدؐ اور میں اباجی کے مزار پر گئے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اباجی اپنے گوشۂ مزار سے مولانا حبیب الرحمٰن کے سلام کا جواب دیں، قبر شق ہوجاتے اور اندر سے وقار و سنجیدگی کا وہی حسین پیکر باہر آکر کھڑا ہوجائے جسے دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آتے تھے، وہی سبز رنگ کا عمامہ، سبز رنگ کا جوغہ، سیاہ غلافی آنکھیں اور خوبصورت چہرہ نظر آجائے۔ جسے اپنے ہاتھوں سے ان کے ہزاروں شاگردوں نے شام کی تاریکیوں میں یہاں دفن کر دیا تھا، فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد میں دیر تک ان کی قبر پر ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا میرے تحت الشعور میں یہی خیال قائم تھا کہ اباجی اب اٹھے اور اب اٹھے مگر ہائے کہ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں۔

رات بڑھتی آئی اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا قبرستان میں اداسیاں پھیل گئیں۔ درخت زور زور سے ہلنے لگے ہواؤں کی سنسناہٹ دل کو توڑے لیتی تھی۔ تاریکی اور اندھیرا سرکش جنات کی طرح سر چڑھے جاتے تھے۔ قبرستان کے کسی گوشے سے کسی طالب علم کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ باہر نکلا تو عیدگاہ کی دوسری طرف سے ہرٹ چلنے کی آواز خاموشی اور سکون کے سینے کو چیرتی اور رات کی تاریکیوں سے لڑتی جھگڑتی آگے بڑھ رہی تھی ہرٹ کی آواز میں کیا کیفیت ہوسکتی ہے؟ نہ خوشی اور مسرت کا نغمہ اور نہ رنج وغم کی دلدوز داستان، مگر میرے دل سے اٹھتے ہوئے رنج وغم کے شعلے، ہرٹ کی آواز میں جذب ہوگئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دل کو کسی نے تھام لیا، میرا سانس ٹوٹا جارہا تھا اسے کسی نے سنبھال لیا، میری روح نکلی جارہی تھی۔ وہ اپنی جگہ تھم گئی۔